

”جدید اسلام“: پاکستان تیونس معاہدہ

عبدالغفار عزیز

جنرل پرویز مشرف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ: ”دنیا کے سامنے اسلام کا حقیقی روشن چہرہ پیش کرنے کی ضرورت ہے“۔ اصولی طور پر ان کی یہ بات بھی درست ہے کہ: ”پاکستان کو ایک ماڈرن ترقی پسند معتدل اسلامی ریاست بنانا چاہیے“۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس سے ان کی مراد کیا ہے؟ اسلام کے جدید تصور اور ماڈرن اسلامی ریاست کے نام پر کمال اتاترک اور متعدد حکمرانوں نے جو گل کھلائے ہیں اور پرویز مشرف نے جس طرح انھیں اپنا آئیڈیل قرار دیا ہے، اس سے یہ سوال ایک گہری تشویش میں بدل جاتا ہے۔ جلتی پر تیل کا کام دورہ امریکہ سے واپسی کے فوراً بعد ان کے دورہ تیونس نے کیا ہے جہاں انھوں نے تیونس کے ساتھ یہ انوکھا معاہدہ کیا کہ ”دونوں مسلم ممالک مل کر اسلام کا جدید ماڈل پیش کریں گے“۔ اس سے پہلے اس نوعیت کا معاہدہ دنیا میں کہیں نہیں ہوا ہوگا۔

تیونس کے حالات سے بے خبر پاکستانیوں کے لیے یہ شاید کوئی اچنبھے کی بات نہ ہو، لیکن جو شخص تیونس اور اس کے ماڈرن اسلام کا حال جانتا ہے، اس کے لیے یہ معاہدہ کسی خوف ناک ایلیے سے کم نہیں کیونکہ سابق صدر بورقیہ اور حالیہ صدر بن علی نے جدید اسلام کے نام پر تمام دینی بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش کی ہے۔ روزہ تک ساقط کر دیا، نماز پڑھنا دہشت گردوں کی علامت قرار دے دیا گیا، عریانی تہذیب و ثقافت کا حصہ بن گئی، ساحل سمندر پر مغربی ممالک جیسے نظارے عام ہو گئے۔ خواتین کے مساویانہ حقوق کے نام پر قرآن کریم کے دراشتی احکام کو

منسوخ کرتے ہوئے ہر خاتون کو اور اہت میں مرد کے مساوی حق دینے کا اعلان کیا، شراب جیسی ام الخبائث کی ہر ممکنہ حوصلہ افزائی کی گئی۔ ایک طویل فہرست ہے جو ماڈرن اسلام کے نام پر مسلط کی گئی۔

”جدید اسلام“ پیش کرنے کی یہ کوئی پہلی یا آخری کوشش نہیں ہے۔ گزشتہ صدی میں ترکی اور مصر سمیت مسلم ممالک کے کئی حکمران یہ جنون پال چکے ہیں۔ اب بھی امریکی سائے تلے پلنے کی خواہش رکھنے والے حکمران اسی کینسر کا شکار ہیں۔ فلسطین میں تحریک مزاحمت ختم کرنے اور صہیونی ریاست سے دوستی کروانے کے لیے گزشتہ پوری دہائی ان کوششوں میں صرف ہو گئی کہ جہاد سے متعلقہ تمام قرآنی آیات، احادیث رسول اور مضامین و تحریروں کو تمام تعلیمی نصابوں سے خارج کر دیا جائے۔ مسلم ممالک کے حکمرانوں کو اب اسی راستے پر مزید آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ ایک تیوسی ”اکالز“ العفیف الاخطر نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے ذرا دل تھام کر اس کا حال بھی سن لیں۔

۴ جولائی ۲۰۰۳ء کو مصر کے دار الحکومت قاہرہ میں ایک کانفرنس میں اس نے کہا کہ ”عالم اسلام میں پھیلتی ہوئی دہشت گردی کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان اب بھی زمانہ قدیم کی اسی فقہ کو درست سمجھتے ہیں جو غیر مسلموں کی تہلیل کرنے کو حرام قرار دیتی ہے۔ ہماری دینی نزکیت ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ اسلام آنے کے بعد تمام سابقہ ادیان منسوخ ہو چکے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ڈکٹری سے لفظ ”کفار“ خارج کر دیا جائے۔“ الاخطر نے اس بات پر فخر کرتے ہوئے کہ ۱۹۵۶ء میں اسی کی تحریک پر جامعہ الزیتونہ بند کی گئی تھی۔ تجویز دی کہ ”تمام مسلم دار الحکومت اپنے ہاں تیونس کے تجربات پر عمل کریں۔“ اس نے کہا کہ ”تمام عرب ممالک کو زندگی کے ہر شعبے میں انسانی حقوق کی تعلیم دینا چاہیے جیسا کہ تیونس میں ہو رہا ہے تاکہ اس اسلامی شعور سے چھٹکارا پایا جاسکے جو حلال اور حرام کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔“ اس نے مغربی دنیا کو عالم اسلام میں براہ راست مداخلت کی دعوت دیتے ہوئے کہا: ”دینی دہشت گردی کا خطرہ مغرب تک جا پہنچنے کے بعد اب یہ آپ کی اپنی ضرورت بھی ہے کہ آپ دینی تعلیم میں اصلاحات کے لیے مسلمانوں کی مدد کریں۔“

ایک اور نام نہاد مسلم دانش ور ڈاکٹر حیدر ابراہیم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ”مسلمانوں کی پستی کی وجہ ان کا اس اختلاف میں پڑے رہنا ہے کہ کیانص ناقاطلی تبدیلی ہے یا اسے زندگی کے معاملات کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے..... مسلمان زندگی کے متعلق سوچنے سے زیادہ آخرت کے متعلق سوچتے ہیں۔“ پھر مزید کھل کر کہا کہ ”مسلمانوں کو اس طرح کی آیات قرآنی کے سحر سے نکل آنا چاہیے کہ ”کنتم حیدر أمة اخرجت للناس..... تم بہترین اُمت ہو لوگوں کے لیے اٹھائے گئے ہو“ کیونکہ اس آیت سے (نعوذ باللہ) تکبر اور تعلی پیدا ہوتی ہے۔

اسی کانفرنس میں ایک اور عرب دانش ور اڈونیس نے ان دونوں کی باتوں کو اپنی مسیحیت کے لبادے میں زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا۔ اس نے کہا: ”معلوم نہیں ہم یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں؟ کیا واقعی ثقافتی تجدید اور صراحت سے بات کرنے کے لیے یا اب بھی ممنوعات (taboos) پر سکوت اختیار کرنے کے لیے؟ تم لوگ بصراحت کیوں نہیں کہتے کہ ترقی کی راہ میں سب سے پہلی رکاوٹ وحی الہی اور اسلام ہے۔ اس بات کو پوری جرأت اور صراحت سے بیان کرنا ہوگا ورنہ ترقی نام کی کوئی چیز وجود میں نہیں آسکے گی۔“

بدقسمتی سے اڈونیس نے یہ خرافات سرزمین ازھر پر مصری وزیر ثقافت کی طرف سے بلائی گئی ایک کانفرنس میں کی۔ اس کے تمام شرکا اسی قبیل کے تھے اور یہ سب کچھ تجدید کے نام پر ہو رہا تھا اور امریکی احکامات پر عمل درآمد کرتے ہوئے ہو رہا تھا۔ امریکی پیمانے کے مطابق یہ سب اقدامات ماڈرن اسلام کی ضروری بنیادیں ہیں۔ ان اقدامات اور دردیدہ وحی کے بعد ہی کوئی شخص معتدل اور جدت پسند ہو سکتا ہے۔ امریکہ کے سرگرم متحرک یہودی ڈینیل پاپس سے پوچھا گیا کہ ”کیا عربوں اور مسلمانوں میں بھی کوئی معتدل افراد پائے جاتے ہیں؟“ اس نے شدت سے نفی کرتے ہوئے کہا: ہرگز نہیں۔ پھر کہا: ہاں البتہ سلمان رشدی اور تیونی صدر زین العابدین بن علی اعتدال پسند شخصیات ہیں۔“ (المجتمع، کویت، شمارہ ۱۳۸۶، جنوری ۲۶-۲۰۰۲ء)

گذشتہ ۳۰ سال میں جنرل پرویز مشرف وہ پہلے پاکستانی حکمران ہیں جو تیونس کے دورے پر گئے اور وہاں تاریخ کا یہ منفرد معاہدہ کر آئے۔ اس معاہدے کے بعد خود تیونس کے عوام نے پاکستان اور اس کے حکمران کے بارے میں کیا تصور قائم کیا ہوگا، جنرل صاحب اور ان

کے کسی ساتھی کو اس کی کوئی پروا نہ ہو۔ لیکن جزل صاحب کے سامنے یہ حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ تیونی صدر حبیب بورقیہ کی سالہا سال کی کوششوں اور بن علی کے سولہ سالہ اقتدار میں دین کے تمام سوتے خشک کر دینے کے منصوبوں کے باوجود ان دنوں تیونی حکمران پریشان ہیں کہ گزشتہ کچھ عرصے سے خواتین میں حجاب کا اور مساجد میں نمازیوں کا تناسب اچانک کیوں بڑھ گیا ہے۔ ”اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا“ کے مصداق ماڈرن تیونس کے حکمران یہ سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ کیا مسلم عوام کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے دُور رکھنے کے لیے کوشش کرنا ایسے ہی ہے جیسے ہوا میں مچھلیاں پالنا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب حقائق جزل پرویز مشرف سے مخفی تھے یا یہ کہ انہی حقائق کی وجہ سے انھیں تیونس کے ساتھ جدید اسلام متعارف کروانے کے لیے معاہدوں کے سفر پر بھیجا گیا اور کیا واقعی جزل مشرف رشدی بن علی کے ساتھ ایک تیسرے مسلمان کا نام لکھوانا چاہتے ہیں۔ وقت بہت جلد ان سوالات کا جواب دینے والا ہے۔ لیکن خود جزل صاحب خالق کائنات اور پاکستانی قوم کو کیا جواب دیں گے؟ ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ کی امین پاکستانی قوم کو؟

تحقیق میں جامعات کا کردار

مسلم سجاد

تحقیق کاوشیں کسی قوم کی زندگی کی علامت ہیں۔ بد قسمتی سے ہم اپنے ملک میں نصف صدی گزارنے کے بعد بھی اس حوالے سے کوئی قابلِ فخر روایت قائم نہیں کر سکے ہیں۔ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں انفرادی اور اجتماعی طور پر نئے حالات اور مہمات مسائل سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ لیکن ہم سنجیدہ تحقیقی رویے اختیار کرنے کے بجائے موقع بہ موقع کسی ایک رجحان کے مطابق صحیح یا غلط حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ایک بد قسمتی تو یہ ہے کہ سائنس کی غیر معمولی اہمیت نے تحقیق کا مطلب سائنسی موضوعات